© rasailojaraid.com

زندگی اور علم النفسیات

از جناب سید مغنی الدین صاحب شمسی ایم اے

انسانی زندگی کیا ہے؟ اور کائنات سے اس کا کیا تعلق ہے؟ ان سوالات کے جواب میں یہی سمجھا جاتا ہے کہ ہم اس دنیا میں سانس لیتے ہیں، چلتے پھرتے اور کھاتے پیتے ہیں تو ہم زندہ کہلاتے ہیں۔ پھر جب سانس آنا بند ہوجاتا ہے اور مرغِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کرجاتا ہے تو ہم مرجاتے ہیں، اب رہا یہ سوال کہ زندگی میں پیش آنے والے واقعات کس نظم اور کس اصول کے ماتحت پیش آتے ہیں؟ تو اس کا جواب عام طور پر یہ دیا جاتا ہے کہ ہر انسان اپنے ساتھ اپنی قسمت بھی لاتا ہے جو کچھ اس کے مقدر میں لکھا ہوا ہے وہی ہوتا ہے اور جب وہ لکھا پورا ہوجاتا ہے تو وہ اس دنیا سے رختِ سفر باندھ کر عالمِ آخرت کو سدھار جاتا ہے۔

آئیے! اب ذرا غور و تعمق کے ساتھ زندگی پر نظر ڈالیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آج فلسفہ و سائنس نے کائنات کی ہر چیز کی نسبت معلومات کا ایک انبار لگا دیا ہے۔ عالمِ طبعیات کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جہاں عصرِ حاضر کے فلک پیما انسان نے پہنچنے اور اس کی حقیقت و ماہیت کے معلوم کرنے کی کوشش نہ کی ہو۔ اس ذوقِ تحقیق و جستجو کا نتیجہ یہ ہے کہ آج انسان اپنے ماحول اور گرد و پیش کی طرح خود اپنی ذات سے متعلق بھی بہ نسبتِ سابق کہیں زیادہ باخبر اور واقف ہے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ جدید انکشافات جس طرح ہمارے علم میں بیش قیمت اضافہ کا باعث ہوئے ہیں، اسی طرح یہ انکشافات اس حقیقت کی بھی غمازی کر رہے ہیں کہ ہم اب بھی کتنے ناواقف ہیں اور ابھی ہمیں کتنا اور واقف ہونا ہے سائنس اور علومِ جدیدہ سب کچھ بتانے کے بعد بھی اب تک ہمیں یقین کے ساتھ یہ نہیں بتا سکے کہ زندگی کہاں سے شروع ہوتی ہے؟ اس کی حقیقت کیا ہے؟ یعنی ہم کہاں سے آرہے ہیں؟

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور کہاں جا رہے ہیں؟ یہ سوالات فلسفہ اور سائنس کے ناخن کے لئے اب تک عقدہائے لانیحل ہی بنے ہوئے ہیں۔ ایک فلسفی کا قول ہے کہ زندگی اس چڑیا کی سی اڑان ہے جو اندھیرے سے نکل کر ایک روشن کمرہ میں آتی ہے اور پھر اس کمرہ سے نکل کر اندھیرے میں ہی چلی جاتی ہے۔ ان دونوں اندھیروں کا درمیانی وقفہ کتنے عجائبات کا حامل ہوتا ہے؟ اس وقفہ میں ہم پر کیا کچھ نہیں گذر جاتا؟ مسرت و غم، تکلیف و راحت اور تندرستی اور بیماری سب ہی کچھ اس مختصر سے وقفہ میں پیش آتا ہے گویا زندگی ایک برتن ہے جو ہمیشہ بھرا رہتا ہے لیکن اس کا پانی لمحہ بہ لمحہ اور ساعت بہ ساعت حوادث و واقعات کے زیر اثر نئے نئے رنگ قبول کرتا رہتا ہے۔ کبھی وہ بے کیف ہوتا ہے تو کہتا ہے۔

بے کیف دل ہے اور جئے جا رہا ہوں میں خالی ہے جام اور پئے جا رہا ہوں میں

اور کبھی مناظرِ فطرت کی رنگینیاں اس کے ذوقِ نشاط اندوزی کو مخمور و سرشار کر دیتی ہیں تو وہ گنگنانے لگتا ہے۔

بخشے ہے جلوۂ گل ذوقِ تماشا غالبؔ چشم کو چاہیئے ہر رنگ میں وا ہو جانا

تاریخِ انسانی میں مسئلہ جبر و قدر کو خاصی اہمیت حاصل رہی ہے "اندھی قسمت" کے قائل اب بھی موجود ہیں۔ یہ اعتقاد زندگی کو محض ایک ہوا بنا دیتا ہے۔ اس قسم کے لوگ ایک جواری کی مانند زندگی سے کھیلتے ہیں۔ دوسروں کی خوش قسمتی پر رشک کرنا اور اپنی بدنصیبی پر بے بس اور مجبور و ناچار کی مانند نوحہ و ماتم کرنا زندگی کے جوہر کو فنا کر دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم علم و حکمت کے ہتھیار ڈال دیتے ہیں اور قدرت نے ہم میں جو صلاحیتیں اور قوتیں ودیعت کی ہیں انھیں مفلوج و بے کار کر دیتے ہیں جو شخص صرف زندہ رہنے کے لئے زندہ ہے اور وہ زندگی کے اصل مقصد پر غور نہیں کرتا اس کے لئے زندگی کی حقیقی مسرت و شادمانی سے لطف اندوز ہونا ناممکن ہے، عام لوگوں کے لئے انسانی زندگی کا مسئلہ صرف ایک ذاتی اور داخلی حیثیت رکھتا ہے لیکن سائنس داں اور فلسفی کائنات میں انسان کے وجود کو خواہ کتنا ہی حقیر اور غیر اہم سمجھے تاہم وہ اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ انسانی افراد میں سے ہر فرد بجائے خود ایک عالمِ صغیر ہے اور اس کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کائنات کی دوسری اشیاء سے اگر دلچسپی ہے اور وہ ان کا علم حاصل کرتا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سب چیزیں اس کی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ چنانچہ اگر انسان کے آنکھ نہ ہوتی تو سورج چاند اور ستارے سب اس کے لئے بے معنی ہوتے۔ اگر اس میں سونگھنے کی قوت نہ ہوتی تو بڑے سے بڑا خوشبودار پھول بھی اس کے لئے بے حقیقت ہوتا۔ اگر اس میں لمس کا احساس نہ ہوتا تو سر بفلک پہاڑوں کی چٹانیں بھی اس کے دل میں خوف و ہراس کی کوئی کیفیت پیدا نہ کر سکتیں اگر اس میں چکھنے کی قوت نہ ہوتی تو امرت اور آبِ حیات، اور زہر ہلاہل وحنظل دونوں اس کے لئے یکساں ہوتے۔ اگر اس کے پہلو میں دل نہ ہوتا تو نشاط و غم اور مسرت والم ان دونوں میں وہ کوئی فرق نہ کر سکتا۔ اس بنا پر یہ ظاہر ہے کہ جہاں تک انسان کی ذات کا تعلق ہے وہ کائنات کا مرکز اور تمام رازوں کا امین ہے اور کائنات کی ہر چیز کی نمود و نمائش انسانی زندگی کی بوقلمونی اور گوناگونی سے وابستہ ہے۔

"بوئے گل پھیلتی کس طرح جو ہوتی نہ نسیم"

اس مرحلہ پر پہنچکر قدرتی طور پر ہمارے سامنے تین سوالات آتے ہیں۔

(۱) کائناتِ عالم میں انسان کی کیا حیثیت ہے؟

(۲) انسان کی تخلیق کا کائنات سے کیا تعلق ہے؟

(۳) انسان کو اپنی زندگی کن اصول پر بسر کرنی چاہئے اور نیز یہ کہ انسانی زندگی کا مقصد کیا ہونا چاہئے

ہمارے پاس ان سوالات کے جوابات معلوم کرنے کے چار ذرائع موجود ہیں یعنی مذہب سائنس، فلسفہ اور نفسیات۔ اس میں شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ انسانی زندگی کا مقصد متعین کرنے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کی تدابیر پر غور کرنے کے لئے یہ چاروں چیزیں بیحد ضروری ہیں کوئی شخص ان کی رہنمائی کے بغیر کسی صحیح نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتا۔

مذہب | ان چاروں چیزوں میں سے پہلے مذہب کو لیجئے۔ مذہب ہماری زندگی کا مقصد متعین کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ ہم خدا کی بندگی کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ ہر مذہب اس کا اعلان کرتا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیکن اسلام نے جس وضاحت اور صفائی کے ساتھ اس مقصد کو سمجھایا ہے کسی اور نے نہیں سمجھایا۔ وہ اس مقصد کی تشریح اس وسعت کے ساتھ کرتا ہے کہ زندگی کا ہر پہلو اور حیاتِ انسانی کا ہر شعبہ معتدل ہو کر اس کے مفہوم میں شامل ہو جاتا ہے وہ کہتا ہے کہ انسان دنیا میں خدا کا خلیفہ بن کر آیا ہے۔ اس بنا پر اس کو حکمتِ نظری و عملی سے آراستہ ہو کر بساطِ ہستی پر حق و انصاف کا پرچم لہرانا چاہئے اور ظلم وجور، بد اخلاقی اور گنہگاری کا استیصال کر دینا چاہئے۔ اقبال مرحوم نے اس ہی حقیقتِ کبریٰ کی طرف ان لفظوں میں اشارہ کیا ہے ؎

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تو زباں تو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تو ہے

اس تعلیم و تلقین سے جہاں انسانی زندگی کا مقصد متعین ہوتا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ تمام کائناتِ عالم میں انسان کا مقام کس قدر اونچا ہے۔ ایک روایت میں انسان کو "بنیانِ رب" کہا گیا ہے اور پھر فرمایا گیا کہ جو شخص کسی انسان کو بے گناہ قتل کرتا ہے وہ اس طرح گویا بنیانِ رب کو ہی منہدم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ زندگی کا نصب العین اور کائنات میں انسان کی حیثیت متعین کرنے کے بعد مذہب انفرادی اور اجتماعی دونوں قسم کی زندگی کے لئے خاص خاص احکام کی تعلیم دیتا ہے جن پر عمل پیرا ہو کر ایک انسان اپنی زندگی کے مقصد کو پورا کر سکتا ہے۔ پھر صرف اتنا ہی نہیں بلکہ موت اور عالم ما بعد الموت کے کٹھن منازل کے متعلق بھی وہ خاص قسم کے تصورات پیش کرتا ہے اور اس طرح زندگی اور اس کی ابتدا و انتہا ہر ایک چیز پر روشنی ڈالتا ہے۔ مذہب کی اس رہنمائی کا تعلق انسانی اعتقاد و یقین سے ہے۔ یعنی وہی شخص اس ذریعہ سے اطمینان و سکون حاصل کر سکتا ہے جو مذہب کی سچائی کا یقینِ کامل رکھتا ہو اور اس کی تعلیمات پر عمل پیرا بھی ہو۔ ورنہ مذہبی احکام سے انحراف کا احساس ہمیشہ اس کے دل میں گنہگاری کی خلش پیدا کرتا رہے گا اور وہ اطمینان سے محروم ہو جائیگا۔

بہر حال اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ تاریخ میں حیاتِ انسانی پر مذہب کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہمیشہ بہت گہرا اور پائدار اثر رہا ہے۔

سائنس | اس کے برخلاف اس سائنس داں کو لیجئے جسے حق کی تلاش ہے، یہ خاص قسم کے حقائقِ قدرت کے مشاہدے اور ان کا تجزیہ و تجربہ کرنے کے بعد ان کو مرتب کرکے قوانینِ قدرت کے استنباط میں اس قدر مصروف ہوتا ہے کہ اس کے لئے زندگی کے تمام مسائل کا دریافت کرلینا ناممکن ہوجاتا ہے۔ تاہم جب وہ اپنے ماحول پر نظر ڈالتا ہے تو جو کچھ اسے معلوم ہوسکتا ہے اس کے جاننے اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہے۔ سرجیمس جین (Sir James Jean) جو ایک بلندپایہ سائنس داں ہے۔ کہتا ہے کہ "کائنات کے انتہائی راز دریافت کرنا سائنس کے حدود سے خارج ہے۔ اور شاید انسانی ذہن انھیں کبھی سمجھ بھی نہیں سکے گا" سائنس نے اب تک جو کچھ معلوم کیا ہے وہ معمولی سمجھ کے تعلیم یافتہ طبقہ کے حدود معلومات سے باہر ہے تاہم سائنس کے کارناموں نے تمدنی اور اجتماعی اعتبار سے جو اثر عوام و خواص کی ذہنیت اور ان کے امیال وعواطف پر کیا ہے وہ معمولی نہیں ہے اور اسے آسانی سے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

صدہا سال تک یہی سمجھا جاتا رہا کہ سورج اور چاند اور دوسرے سیارے (Planets) زمین کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ گویا ہماری زمین کائنات کا مرکز ہے لیکن کوپرنیکس (Copernicus) کے غور و فکر نے یہ ثابت کیا کہ سورج زمین کے گرد چکر نہیں لگاتا بلکہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے، اس حقیقت کے معلوم ہوجانے کے بعد تمام دنیا کو اپنے خیال میں ردو بدل کرنا پڑا اور اس پر یہ ظاہر ہوگیا کہ ہماری زمین کائنات کا مرکز نہیں ہے بلکہ آسمان میں سورج ایسے اور بڑے بڑے عظیم الشان سیارے موجود ہیں جن کے مقابلہ میں زمین ایک رائی کے دانہ کی برابر حیثیت رکھتی ہے،

اس نظریہ کے اعلان نے انسان کو جو "ہمچو من دیگرے نیست" کا نقارہ بجاتا چلا آیا تھا چوکنا کردیا اور اس نے پہلے پہل خود فریبی کے جذبہ کو تسکین دینے کے لئے جو جو جتن کئے اس کا ایک ادنیٰ مظاہرہ یہ بھی تھا کہ غریب گلیلو (Galileo) کو سزائے موت کا حکم سنا پڑا۔

کئی صدیوں تک سائنس داں کائنات کو محض اندھی طاقتوں کا ایک کھیل سمجھتے رہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان لوگوں کا خیال تھا کہ وہ اس زبردست میکانی مشین کے تمام میکانی اصول سمجھ گئے ہیں اور یہ دنیا انھیں میکانی اصول پر چل رہی ہے۔ اس غور و فکر پر جس تمدن کی بنیاد رکھی گئی اس کا مادی ہونا لازمی امر تھا لیکن آج کل کے سائنس داں اس تشریح کو ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اگر بنظرِ غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ خود سائنس دانوں نے ہی مادیت کے پرخچے اڑا دیئے ہیں۔ چنانچہ سائنس نے مادہ کا تجربہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچی کہ کسی شے کا چھوٹے سے چھوٹا ذرہ مادہ کی آخری تقسیم ہے جس سے مادہ مرتب ہوتا ہے۔ جب اس چھوٹے سے چھوٹے ذرہ کو بھی توڑ ڈالا گیا تو یہ نتیجہ اخذ ہوا کہ مادہ کی آخری تقسیم جزرِ لاتجزیٰ ہے اور مادی دنیا بجائے چار کے سو سے زائد عناصر سے مرکب ہے۔

پھر یہ انکشاف ہوا کہ مادہ کی یہ تقسیم بھی انتہائی تقسیم نہیں ہے اگرچہ مادہ ان اجزاء لاتجزی سے مرکب ہوتا ہے لیکن ان اجزا کی ترتیب آپس میں گتھی ہوئی اور باقاعدہ نہیں ہوتی۔ نیز یہ جزر لاتجزی کوئی ٹھوس چیز نہیں ہے بلکہ ہر جزر کو ایک نہایت چھوٹا سا نظامِ شمسی سمجھنا چاہیئے۔ جس طرح سورج کے گرد زمین، چاند اور دوسرے سیارے گردش کرتے ہیں ٹھیک اسی طرح جزر لاتجزی کے ذروں میں سے ایک ذرہ مرکز ہوتا ہے اور دوسرے ذرے اس مرکز کے گرد لاتناہی طور پر گردش کرتے رہتے ہیں۔ اب یہاں قابلِ غور یہ بات ہے کہ ہم نے جب آخری تقسیم کو جزر لاتجزی مان لیا تو اب اس کے ذرے کس طرح ہوسکتے ہیں؟ ان کو ذرہ کہنا ہی غلط ہوگا۔ ان ذروں کو سائنس کی اصطلاح میں الکٹرون (Electron) یعنی برقیہ کہتے ہیں اور انھیں ذروں کا مرکز پروٹون (Proton) کہلاتا ہے اس مرکزی ذرہ میں مثبت برق ہوتی ہے جس کی کشش سے الکٹرون یعنی دوسرے ذرے اس کے گرد گردش کرتے رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ الکٹرون میں منفی برق ہوگی۔

مادہ کی ساخت سے متعلق ان انکشافات کے بعد جو فکر اب تک اس کے متعلق رائج تھا وہ ایک بنیادی فکر کی حیثیت رکھتا تھا لیکن اب سائنس دان کائنات کی ساخت کی تشریح صرف اقلیدس کے ابعادِ ثلاثہ یعنی طول او رعرض و عمق سے نہیں کرسکتے۔ اب ابعادِ اربعہ کا علم ہندسہ ایجاد ہوچکا ہے جیسے آئن سٹائن (Einstein) کے نظریۂ اضافیت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس نظریہ کو احصائے ٹینسر (Tensor Calenlus) کے نہایت پیچیدہ اور دقیق عملِ ریاضی کو سمجھنے کے باوجود عام فہم زبان میں سمجھانا مشکل ہے۔ بہرحال عام اذہان پر ان نظریوں کا اتنا اثر ضرور ہوا ہے کہ وہ اس ٹھوس دنیا کو اب ایسا نہیں سمجھتے جیسا کہ وہ سطحی طور پر نظر آتی ہے یا محسوس ہوتی ہے۔ اس طرح سائنس اور علم ہیئت (Astronomy) کے انکشافات میں جتنا اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ کائنات کے تصور میں وسعت پیدا ہورہی ہے۔ اس تصور سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ پہلے یہ سب انتشار ایک ہی ساعت اور ایک ہی نقطہ سے شروع ہوا ہوگا لیکن سائنس داں ہمیں یہ نہیں بتاسکے کہ اس کائنات کی تخلیق کا مقصد کیا ہے؟ اور نیز یہ کہ اس کی ابتدائی کیفیت کیا تھی؟ بہرحال پیدائشِ عالم کا وہ مذہبی تصور جسے کن فیکون سے تعبیر کیا جاتا ہے اب سائنس اس سے نہیں ٹکراتی یعنی اس کی مخالفت نہیں کرتی۔

سائنس کے افکار و نظریات عوام کی سمجھ سے بلند سہی لیکن اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ زندگی سے متعلق عام لوگوں کے تخیل پر ان چیزوں کا کافی اثر ہوتا ہے۔ اگر سائنس مادیت پر اصرار کرے تو اس فلسفہ میں انسانی روح جیسی اہم چیز کے لئے کوئی گنجائش نہیں رہتی لیکن اب جبکہ سائنس دانوں نے مادہ کو خود فنا کردیا ہے اور ان کا رجحان زیادہ تر اس نظریہ کی طرف ہے کہ مادہ اور روح کا باہمی اتحاد ایک دوسرے کے ساتھ امدادی حیثیت کا ہے یعنی وہ ایک ہی شے کے دو مختلف مظاہر ہیں تو اس کا اثر عام لوگوں پر یہ ہورہا ہے کہ اب وہ بھی یہ سمجھنے لگے ہیں کہ محض مادی خوشحالی ان کی مسرت کا باعث نہیں ہوسکتی۔ نیز یہ کہ مادی زندگی کا خوشگوار ہونا زندگی کا اعلیٰ نصب العین بھی نہیں ہے۔ اب ان کی توجہ زیادہ تر باطنی مسرت حاصل کرنے، اپنی شخصیت کے ارتقا اور مادی قوتوں کے ساتھ روحانی قوتوں کو بھی ترقی دینے کی طرف متوجہ ہوگئی ہے۔

علمِ طب یا ڈاکٹری نے بھی ہمارے جسم کے اعضا اور ان کے وظائف و عوارض کی نسبت بہت کچھ معلومات فراہم کرکے اور قسم قسم کی دواؤں اور طریقہائے علاج کو دریافت کرکے ہمیں بہت کچھ فائدہ پہنچایا ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس کا تعلق صرف ہمارے جسم سے ہے اور کوئی شبہ نہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کہ جہاں تک جسمانی صحت کی نگہداشت اور اس کی حفاظت کا تعلق ہے یہ علم ہمارے لئے بیش از بیش فوائد کا حامل ہے لیکن اس سے کسی عام انقلابِ ذہنی کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اس کے برخلاف فلاسفہ کے افکار و خیالات سوسائٹی کی ذہنیتوں پر جو اثر ڈالتے ہیں وہ بہت گہرا اور دیرپا ہوتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ فلسفہ بعض اوقات ہمارے ذہن میں ایک ایسی چیز کا تصور پیدا کرتا ہے جو موجود نہ ہو، لیکن اس کے باوجود وہی چیز ہمارے لئے حسن و قبح کا معیار بن جاتی ہے۔ مثلاً جب ہم آئیڈیل (Ideal) کا لفظ بولتے ہیں تو ہماری مراد ایک ایسا مکمل ذہنی تصور ہوتا ہے جس کا خارج میں وجود نہ ہو۔ لیکن اس کے باوجود اس تصور کو اصل قرار دے کر عملی زندگی میں اسی کی نقل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے یہ لفظ Ideal افلاطون کے فلسفہ سے لیا گیا ہے اس کے نزدیک ہر خارجی حقیقت کے لئے ایک عینی یا مثالی حقیقت کا وجود ضروری تھا جو عالمِ مثال میں پائی جائے۔

افلاطون کے برخلاف ارسطو مشاہدہ کا قائل تھا۔ اس کی تلاش اور جستجو کا نصب العین صداقت اور حقیقت تھا۔ اس کے نزدیک درست، معقول اور مناسب وہی چیز ہو سکتی ہے جو سب کے لئے مفید ہو اور سب اس سے مسرت حاصل کر سکیں۔ ارسطو کے نزدیک اصلی مسرت کا راز اعتدال اور توازن قائم رکھنے میں پنہاں ہے مثلاً فضول خرچی اور بخل کے درمیان کفایت شعاری حدِ اوسط ہے اور یہی اعتدال ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ارسطو بہ نسبت افلاطون کے زیادہ حقیقت بیں اور حقیقت شناس تھا چنانچہ اس کی تعلیم کا اثر سکندر کے کارناموں سے ظاہر ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ شاگرد نے استاد کے نظریۂ اعتدال پر عمل نہیں کیا اسی وجہ سے سکندر کی زندگی میں متعدد مثالیں نہایت شدید بے اعتدالی کی ملتی ہیں اور عجب نہیں بے اعتدالیوں کے ہی باعث وہ ۳۳ سالہ زندگی کی قلیل مدت میں ہی اس دنیا سے رخصت ہو گیا ہو۔ ارسطو کے فلسفہ کا اثر یورپ کے دماغ پر بھی بہت کچھ ہوا ہے۔

ایک فلسفی کی اپنی زندگی میں اس کے فلسفہ کا اثر اس کے ماحول یا عوام پر بہت کم ظاہر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوتا ہے لیکن اس کی وفات کے بعد جب دنیا اس کے خیالات کا مطالعہ کرتی ہے اور اس کا فلسفہ رائج ہوتا ہے تو وہ انقلابِ عظیم پیدا کر دیتا ہے۔

روسو کے چیدہ چیدہ خیالات نے اپنے زمانے میں وہ روح پھونکی جس کے زیرِ اثر انقلابِ فرانس نے جنم لیا اور انسانی قید کی زنجیروں کو توڑ دیا۔ آزادی، مساوات اور اخوت و ہمدردی کے الفاظ اب بھی ہمارے کانوں میں گونج کر ہمیں اس نصب العین کے حاصل کرنے کے لئے ابھارتے رہتے ہیں چنانچہ انقلابِ فرانس کے بعد دوسری قوموں نے جن میں ریاستہائے متحدہ امریکہ بھی شامل ہے سر اٹھایا اور آزادی حاصل کی۔ حقیقتاً امریکہ کی سول جنگ غلامی کو دور کرنے کے لئے لڑی گئی تھی۔ ابراہیم لنکن گو صحیح معنی میں فلسفی نہ تھا لیکن طرزِ حکومت کی جو بنیاد اس نے رکھی ہے اس کا چار دانگ عالم میں اب بھی ڈنکا بج رہا ہے جس کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں پر خود اس قوم کے افراد اپنی قوم کی فلاح و بہبود کے لئے حکومت کریں۔

جیرمی بنتھم (Jeremy Benthem) اٹھارویں صدی کے انگریز مصنف نے فلسفۂ افادیت کی بنیاد رکھی یعنی یہ کہ انسانوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں زیادہ سے زیادہ مسرت پہنچانا ہمارا انتہائی مقصد ہونا چاہئے۔ اس نظریے نے اس زمانہ کی نسل پر گہرا اثر کیا اور آئندہ اصلاحات کی بنیاد پھر اسی نظریئے پر رکھی گئی، جماعتی تفوق کا سدباب اس نظرئے کا لازمی نتیجہ تھا۔ چنانچہ اب بھی اس کے ماننے والے کثیر تعداد میں موجود ہیں۔ یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ یہ نئے نئے پیش آمدہ خیالات دراصل ہمارے علم میں کوئی خاص اضافہ نہیں کرتے بلکہ ان کی حقیقت کا اظہار ان جذبات سے ہوتا ہے جو کانوں میں پڑنے سے ابھرتے ہیں۔ وہ زندگی کے مقصد کی کوئی مفصل تشریح نہیں کرتے بلکہ وہ زندگی کے مقصد دریافت کرنے میں سنگِ راہ کا کام دیتے ہیں۔

زندگی کی حقیقت کی تلاش اور مقصدِ زندگی متعین کرنے میں ہمیں ایک اور ذریعہ سے بھی مدد پہنچ سکتی ہے۔ مذہب ہمارے سوالات کا جواب الہامی انداز میں دیتا ہے۔ سائنس خارجی دنیا میں جو کچھ اسے نظر آتا ہے اس کا تجزیہ کر کے ہمارے سامنے پیش کر دیتی ہے۔ فلسفہ سائنس کے حقائق کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

روشنی میں حقیقت کے مختلف پہلوؤں کو یکجا کر کے ہمارے سامنے کائنات کے حقائق اور ان کے نتائج پیش کرتا ہے۔ نفسیات ہم کو خود ہمارے متعلق کچھ بتاتی ہے اور ہمیں خود اپنی فطرت و ذہنی ساخت سے آگاہ کر کے ہماری زندگی کو کامیاب بنانے میں ہماری مدد کرتی ہے۔

نفسیات | ایک عرصہ تک ماہرینِ نفسیات بھی فلسفیوں کی طرح اپنے ماحول سے کچھ بے تعلق سے رہے۔ اس عرصہ میں ان کا مقصدِ جستجو یہی رہا کہ آیا انسان میں روح ہے یا نہیں۔ اور اگر روح ہے تو اس کا انسانی جسم سے کس قسم کا تعلق ہے۔ یہاں تک کہ انیسویں صدی میں جدید انکشافات کے ذریعہ انھیں معلوم ہوا کہ انسان میں روح ہے اور اس کے وظائف سے ہم آگاہ بھی ہو سکتے ہیں۔

سائنٹفک طریقۂ تحقیق اختیار کرنے کے بعد علمِ نفسیات کے دائرے میں جو انکشافات ہوئے انھوں نے موجودہ زمانے میں انقلاب برپا کر دیا۔ گو ان کی تلاش و جستجو ابھی بہت کچھ تشنۂ تمام ہے پھر بھی جو معلومات اب تک حاصل ہوئی ہیں ان سے بہت کچھ مدد مل رہی ہے۔ ان معلومات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اول یہ کہ انھوں نے انسانی کردار کا گہرا مطالعہ شروع کیا اور اس کے متعلق بہت کچھ معلومات جمع کیں۔ مثلاً یہ کہ انسانی کردار کا منبع کیا ہے، فہم و ادراک کا ارتقا کس نہج پر ہوتا ہے۔ ایک انسان کی قوتِ ادراک میں کیا کیا عنصر شامل ہوتے ہیں۔ اور دوسرے یہ کہ انھوں نے ہمیں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ جسم اور نفس کا آپس میں ایک دوسرے پر کیا اثر مرتب ہوتا ہے یعنی جسم کا نفسِ انسانی اور کیرکیٹر پر کیا اثر ہوتا ہے اور نفس کا جسم پر کیا اثر ہے۔

نفسیات کے عالموں کی جستجو کا عام نتیجہ جو برآمد ہوا، یہ ہے کہ ہم کو اس کے ذریعہ خود اپنے ہی کو سمجھنے میں نہیں بلکہ دوسروں کو بھی سمجھنے میں بڑی مدد ملی۔ ... یہ علم کہ ہمارے اعمال و افعال شعوری اور لاشعوری دونوں کیفیتوں کا نتیجہ ہو سکتے ہیں۔ نفسیات سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ ہمارے اخلاق کی بنیاد بچپن میں ہی پڑ جاتی ہے۔ وہ اثرات اور کیفیات جو بچپن میں جزوِ ذہن بن جاتی ہیں ان کا اثر تمام عمر باقی رہتا ہے ملو ریہ اثرات اور کیفیات ہمارے ذہن میں لاشعوری طور پر محفوظ رہتی ہیں اور پھر آئندہ زندگی میں ہمارے افعال پر متواتر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں اور ہم اس کے اثر سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بالکل بے خبر ہوتے ہیں۔

بچپن کے یہ اثرات اکثر ہمیں مضر معلوم نہیں ہوتے لیکن جب ماحول یا بچپن کے خراب اثرات کی وجہ سے ہمارے کیریکٹر میں کوئی خرابی پیدا ہو جاتی ہے جو ہمارے مقاصد کے حصول میں حارج ہوتی ہے .... یا زندگی میں اس کی وجہ سے کچھ دشواریاں پیدا ہو جاتی ہیں تو معالجہ نفسیات کے ذریعہ بارہا ایسی خرابیاں دور کی جا سکتی ہیں معالجۂ نفسیات کے کئی مسلک یا مذہب ہیں اور اسی اعتبار سے ان کے طریقۂ علاج میں بھی اختلاف ہے۔ بہر حال معالجہ کے اس جدید طریقے سے ہمیں کافی مدد مل رہی ہے اور آئندہ اور زیادہ ملنے کی توقع ہے۔

اگر ہمارے کیریکٹر میں کوئی خرابی یا خلل نہ بھی ہو تب بھی نفسیات ہمیں اپنے آپ کو سمجھنے میں بڑی مدد دیتی ہے مثلاً کوئی شخص کسی جگہ ملازم ہے اور وہ اس جگہ سے کسی اچھی جگہ پر ترقی کر کے جانا نہیں چاہتا حالانکہ اس کے لئے مواقع بہت سے ہیں لیکن اپنی اسی ملازمت پر قانع ہے اور اس میں پست ہمتی کے سے جذبات پیدا ہو گئے ہیں۔ ایک دن اس کی ملاقات ایک معالجِ نفسیات سے ہو گئی۔ ماہرِ نفسیات نے اسے بتایا کہ چونکہ وہ اپنے ماں باپ کا سب سے بڑا لڑکا تھا اور اس سے چھوٹے دو بچے اور بھی تھے۔ اس لئے جب اس کے والدین کے ہاں اس کے بعد کا بچہ پیدا ہوا تو ان کی توجہ اس کی بہ نسبت چھوٹے بچے کی طرف زیادہ ہو گئی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ پست ہمت ہو گیا اور خودداری اور ترقی کے جذبات اس سے بالکلیہ فنا ہو گئے۔ وہ شخص یہ معلوم کر کے اپنی غلطی کو محسوس کرنے لگا اور اس کے دل میں ترقی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ چنانچہ اس نے پھر آگے ترقی کی اور اپنی نفسیات کے سمجھنے میں دلچسپی لینی شروع کر دی۔

اسی طرح بچپن کی زندگی کا کوئی شدید صدمہ آئندہ زندگی میں اس کو بزدل یا خوفزدہ بنا دیتا ہے۔ بیشتر جرائم شعوری طور پر بے ارادے پر [illegible] ہوتے بلکہ وہ اوائل عمر کے واقعات اور ماحول کے سبب کیریکٹر میں کسی خرابی یا خلل پیدا ہو جانے سے رونما ہوتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بعض اشخاص میں ہر چیز کے جمع کرنے یا اٹھا لینے کی بری عادت ہوتی ہے۔ انھیں اشیا کے جمع کرنے میں جو طریقہ بھی اختیار کرنا پڑے وہ اس کے استعمال کرنے میں دریغ نہیں کرتا۔ بعض اوقات جو اشیا وہ چوری کرتے ہیں کوئی قیمتی یا ایسی نہیں ہوتیں جن کی ان کو حقیقتاً ضرورت ہو۔ ایسی بری خصلتوں میں بعض اچھے اور دولتمند گھرانوں کے افراد بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس عیب کے علاوہ ان کے کیریکٹر میں اور کوئی بات قابلِ اعتراض نہیں ہوتی۔ کچھ عرصہ پہلے ایسے اشخاص کو چوری کا مجرم سمجھا جاتا تھا بلکہ سو سال پہلے شاید ایسے آدمی کو سخت سزا دی جاتی ہو، لیکن آج ہم اس کے اس جرم کو اس کے ذہن میں ایک خاص نقص یا کمزوری کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور اسے بجائے سزا دینے کے اس کے علاج کا فکر کرتے ہیں۔

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ تعزیرات کی اصلاحات جو آج کل ہو رہی ہیں وہ فقط انسانی محبت اور ہمدردی کے جذبہ کے ماتحت نہیں کی جا رہی ہیں بلکہ وہ انسانی کردار کی ماہیت و فطرت کے متعلق باقاعدہ علم کے مرتب ہو جانے کا ایک لازمی نتیجہ ہیں۔ اگر کسی ایسے شخص سے جس کا دماغ خراب ہو، کوئی مہلک جرم سرزد ہو جائے تو ہم اسے اس جرم کی اصلی سزا کا مستحق نہیں سمجھتے بلکہ اسے دماغی امراض کے ہسپتال میں داخل کر دینے کا مشورہ دیتے ہیں۔

طبعی کردار ہم اسے سمجھتے ہیں جو ایک صحت مند، صحیح تربیت یافتہ انسان میں طبعی جبلت و فطری جذبات کی روشنی میں رونما ہو۔ ایک شخص بہت سی خلقی اور پیدائشی صفات اپنے ساتھ لاتا ہے، لیکن انسانی کیریکٹر میں بہت سے ایسے عنصر موجود ہوتے ہیں جو عام توقع کے خلاف اکتساب کے ذریعہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ اپنے اخلاق کا مطالعہ کرے۔ علم نفسیات میں ایک خاص باب بچپن اور شباب کے زمانہ کے مسائل پر بحث کے لئے قائم کیا گیا ہے۔ عنفوانِ شباب سے مراد مردوں کے لئے عمر کا وہ حصہ ہے جو ۱۴ سال سے پچیس سال تک کا ہوتا ہے اور عورتوں کے لئے ۱۲ سال سے ۲۱ سال تک کا۔ اس باب میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کسی فرد کے ذاتی اعمال میں عنفوانِ شباب کے ارتقائی زمانہ کو کتنا دخل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی سمجھانے کی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کوشش کی گئی ہے کہ آئندہ زندگی کی مشکلات کو دور کرنے کے لئے ایک بچے کی تربیت کن اصول کو پیشِ نظر رکھکر کرنی چاہیئے۔ ان نفسیاتی تحقیقات کے ذریعہ ہم اپنی اور آئندہ نسلوں کی زندگی سدھانے میں کافی مدد لے سکتے ہیں۔

گو ماہرینِ نفسیات طبعی کردار اور حقیقی کیریکٹر کے متعلق ہمیں کوئی کامل معیار مقرر کر کے نہیں دے سکتے پھر بھی مجموعی طور پر وہ اتنا بتلا سکتے ہیں کہ فطرت صحیح توازن قائم رکھنے اور کشاکش سے معرا حالت کا نام ہے۔ علمِ نفسیات دیکھا جائے تو ہمارے لئے ایک امید افزا پیغام ہے، ہماری زندگی کی فلاح و بہبود اور خوشی اور مسرت حاصل کرنے میں ماہرینِ نفسیات ہماری بہت کچھ مدد کر سکتے ہیں یعنی وہ ہمیں اپنے آپ کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں اور ہم اپنے کیریکٹر کی خرابیوں کو خود سمجھ کر انھیں دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں، بعض اوقات یہ خرابیاں چھوٹی ہونے کی وجہ سے ہمیں محسوس نہیں ہو سکتیں۔ لیکن ماہر نفسیات تحلیلِ نفسی کے ذریعہ ہمیں یہ بتا سکتا ہے کہ آیا یہ خرابیاں چھوٹی ہیں اور چشم پوشی کے قابل ہیں، یا کوئی مہلک صورت اختیار کر سکتی ہیں یا کر چکی ہیں۔ غرض کہ عملی زندگی کے ہر شعبہ میں کامیابی کے لئے نفسیات نے ہمارے لئے نئے نئے راستے پیدا کر دیئے ہیں۔

پیشے کے انتخاب میں بھی نفسیات ہماری رہنمائی کر سکتی ہے ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ کونسا پیشہ ہمارے لئے مناسب ہوگا یعنی یہ کہ ہم کس قسم کا کام بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔ اگر کسی کام میں یکسانیت ہو، یعنی صبح سے شام تک متواتر ایک ہی قسم کا کام انجام دینا ہو تو نفسیات ایسی صورت میں ہمیں تکان دور کرنے کے طریقے بتا سکتی ہے۔ تکان میں تخفیف ہو جانے سے ہمیں ان کاموں میں جو نہایت خطرناک قسم کے ہوتے ہیں بڑی مدد ملتی ہے۔ نفسیات کے اس شعبہ کا نام صنعتی نفسیات ہے۔ یہ شعبہ اس امر کی تحقیق کرتا ہے کہ انسان کے لئے اس کام کی ایک خاص رفتار کتنے عرصے تک قائم رکھی جا سکتی ہے اور کام کرنے والا کتنے عرصہ تک اپنی پوری توجہ اس کام کی طرف قائم رکھ سکتا ہے۔ نفسیات کی اس تحقیق سے مزدور اور مالکِ کارخانہ دونوں کا کام بخوبی ہو جاتا ہے۔ مالک کا کام بہتر ہونے لگتا ہے اور مزدور کو کام اس کے حالات اور صلاحیت کے مطابق ملتا ہے، مزدور کے مناسب آرام اور ضرورت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا خیال رکھنے سے وہ خوشی خوشی کام بھی بہت کر لیتا ہے۔

اسی طرح نفسیات ہماری خرابیاں دور کرنے میں مدد کرتی ہے، وہ خرابیاں خواہ مہلک قسم کی ہوں یا معمولی قسم کی، ان کے دور کرنے کے لئے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ فی الواقع ان خرابیوں کا ماخذ کیا ہے؟ ان کے پیدا ہونے کا کیا سبب ہے؟ یہ معلوم ہونے کے بعد اس خرابی کا دور کرنا زیادہ مشکل نہیں رہتا اس عمل کا نام تحلیلِ نفسی (Psycho-analysis) ہے۔ نفسیاتی خرابیوں اور مشکلات کا منبع معلوم ہونے کے بعد ان کے دور کرنے کا راستہ پیدا ہو جاتا ہے اور اکثر و بیشتر بسہولت دور ہو جاتی ہیں

مثلاً فرض کیجئے ایک نہایت خوبصورت لڑکی ہے جس پر شرم و حیا اس درجہ غالب ہے کہ وہ اپنی بے تکلف ہمجولیوں میں بھی چپ چپ اور خاموش رہتی ہے وہ جن لوگوں سے ملنا چاہتی اور ان کو غم اور خوشی میں اپنا شریک بنانا چاہتی ہے ان سے بھی بات کرتی ہے تو بڑی جھینپی ہوئی ہو کر، ایسی لڑکی کو اگر ایک ماہرِ نفسیات دیکھے گا تو وہ یہی تجویز کرے گا کہ اس لڑکی میں احساسِ کمتری Inferiority Complex بدرجۂ غایت موجود ہے۔ بچپن میں اس کے والدین نے اسے سمجھنے کی کوشش نہیں کی چونکہ وہ لڑکی سادہ مزاج تھی اور اسے صرف اپنے سے زیادہ عمر کے بچوں میں رہنے کا موقع ملا تھا اور وہ بچے اپنے احساسِ برتری کی وجہ سے اسے بڑی بے دردی سے ستاتے رہتے تھے اس لئے نتیجہ یہ ہوا کہ اس لڑکی میں لاشعوری طور پر اپنی کمتری کا احساس راسخ ہو گیا اور وہ سب کے مقابلہ میں اپنے آپ کو حقیر و کمتر محسوس کرنے لگی۔

ایسے واقعات روزانہ ہمارے تجربے میں پیش آتے رہتے ہیں۔ ماہرِ نفسیات اس خرابی کو معلوم کر لیتا ہے اور وہ یہ بھی جان جاتا ہے کہ یہ خرابی کیونکر پیدا ہوئی۔ خرابی اور اس کا سبب معلوم ہونے سے نصف مشکلات حل ہو جاتی ہیں۔

ایک مرتبہ ایک اخبار میں ایک لڑکی جس کی عمر ۱۷ سال تھی خودکشی کرنے کی خبر شائع ہوئی تھی لیکن اسے پانی میں ڈوبتے ڈوبتے بچا لیا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں معلوم ہوا کہ ایک پرچہ میں جو اس نے خودکشی سے پہلے اپنی ماں کے نام لکھا تھا کہ چونکہ تمام لوگ اس کے مخالف ہیں اس لئے وہ اِس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دنیا میں اور زیادہ زندہ نہیں رہ سکتی"۔

اس لڑکی پر جب خودکشی کا مقدمہ دائر ہوا تو اس نے عدالت میں بیان دیا کہ اس کے اپنے بہن بھائیوں سے تعلقات خوشگوار نہیں تھے اس لئے وہ اس دنیا کو چھوڑنا چاہتی تھی۔ اس کا طبی معائنہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اسے کوئی جسمانی عارضہ نہیں ہے اور اسے صرف معالجۂ نفس کی ضرورت ہے چنانچہ ماہر نفسیات کی یہ تشخیص تھی کہ کچھ عرصہ سے اس کے سامنے زندگی کا کوئی مقصد باقی نہیں رہا تھا اور زندگی اسے بالکل بے مقصد چیز نظر آتی تھی۔

درحقیقت بچپن اور عنفوانِ شباب کے زمانہ میں بعض واقعات اور ماحول کی بنا پر ہمارے ذہن میں جذبات کی کچھ ایسی گرہیں لگ جاتی ہیں کہ پھر وہ تمام عمر نہیں کھلتیں۔ یہ گرہ اندر ہی اندر لاشعوری طور پر ہماری زندگی کو دشوار بنا دیتی ہے۔ یہ حقیقت واضح ہو جانے کے بعد ہم اپنی اور اپنے بچوں کی زندگی بہت کچھ درست کر سکتے ہیں۔ ماہرینِ نفسیات نے زندگی کے حقائق کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور اس کے اندرونی امراض کے ایسے اسباب و علاجات بیان کئے ہیں جن پر ہمارا دور کا بھی شبہ نہیں ہو سکتا۔ ان انکشافات کے سمجھنے کے بعد ہم اپنے آپ کو اور دوسروں کو بہتر سمجھ سکتے ہیں۔ اور اس طرح اپنی زندگی کا کوئی کامیاب مقصد بھی پیدا کر سکتے ہیں اور ذہنی اور جسمانی ہر دو اعتبار سے ایک کامیاب زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ یقیناً ذہنی اور جسمانی دونوں قسم کی صحت کے درست ہونے کو کون برا کہہ سکتا ہے جب تک دماغ اور جسم درست نہ ہوں گے زندگی کے حقیقی مقصد سے ہم بہت دور رہیں گے۔

انسانی اعمال واخلاق کی خامیاں دور کرنے اور ذہن و دماغ پر قابو پا لینے کے متعلق معلومات فراہم کرنے کے علاوہ علمِ نفسیات نے جسم اور روح کے آپس کے تعلقات پر بھی کافی روشنی ڈالی ہے یعنی یہ کہ نفس کا اثر روح کے لئے کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے اسی طرح روحانی امراض کا صدمہ جسم کے لئے مضر ثابت ہوتا ہے اب تجویز یہ ہے کہ نفسیات اور تحلیلِ نفسی ڈاکٹری یا طب کے نصاب میں لازمی مضامین کی حیثیت سے شامل کر لئے جائیں۔

اس سلسلے میں غدود کے متعلق علمِ طب کا جدید نظریہ قابلِ غور ہے۔ ان غدودوں سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جنھیں ہم محض بے کار سمجھتے تھے جدید معلومات کے مطابق ایسی رطوبات خارج ہوتی ہیں جن کا ہمارے جسمانی نشو و نما سے گہرا تعلق ہے مثلاً درقیہ (Thyroid) غدود کی خرابی کا نتیجہ جسمانی اور روحانی دونوں صورتوں کی خرابی میں نمودار ہوتا ہے۔ چنانچہ بعض وہمی مریض اپنے آپ کو مریض خیال کرتے ہیں۔ ظاہری علامات سے ان کی بیماری ظاہر بھی ہوتی ہے لیکن حقیقتاً ان کی بیماری کا تعلق جسم سے نہیں بلکہ نفسیاتی یا دماغی کیفیت کی خرابی سے ہوتا ہے۔

یہاں ایک دلچسپ مثال قابلِ ذکر ہے اس سے آپ کو جسم پر لاشعوری نفسیاتی کیفیت کا اثر ظاہر ہو جائے گا۔ ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم کے دوران میں ایک سپاہی کا بازو شل ہو گیا۔ چنانچہ اسے لڑائی سے واپس بلا لیا گیا۔ طبی ماہرین اور ڈاکٹر معائنے کے بعد اس بات سے مطمئن تھے کہ واقعی وہ اپنے بازو کو حرکت نہیں دے سکتا۔ اس کے برخلاف ماہرینِ نفسیات کو اس بات کا یقین تھا کہ لڑائی کے میدان سے الگ ہونے کے لئے اس کے لاشعوری نفس نے یہ حیلہ اختیار کیا تھا۔ حقیقتاً اس کے بازو کے اعصاب و پٹھے بیکار نہیں ہو گئے تھے بلکہ لاشعوری نفس کا اس کے جسم پر پورا کنٹرول تھا اور خود سپاہی کو اس گرفت کی خبر نہ تھی۔

اسی طرح نفس پر جسم کے کنٹرول کی مثال بھی آسانی سے دی جا سکتی ہے چنانچہ جسم کا کوئی عیب یا نقص کا اثر انسان کی نفسیات اور اخلاق پر بہت گہرا پڑتا ہے اگرچہ یہ اثر لازمی نہیں ہے مثلاً تیمور لنگڑا تھا۔ راجہ رنجیت کی صرف ایک آنکھ تھی۔ بلکہ بہت ممکن ہے کہ اس عیب ہی کا ان کے کردار کو نمایاں اور کامیاب بنانے میں حصہ ہو۔ بعض انسان جسمانی نقائص پر غلبہ پا لیتے ہیں، امریکہ کے سابق پریذیڈنٹ روزویلٹ پر جوانی میں فالج گرا تھا لیکن اس مرض کا ان کے کیریکٹر یا کردار پر کوئی مضر اثر نہیں پڑا۔ بہت سے شاعر اور ادیب آنکھوں سے محروم ہونے کے باوجود شعر و ادب میں کمال رکھتے ہیں۔

ابھی نفسیات کے ماہرین کا کام مکمل نہیں ہوا ہے لیکن جتنا کچھ ہوا ہے وہ بہت ہے یہاں ہمارا مقصد نفسیات کے کام کا جائزہ لینا نہیں ہے بلکہ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ نفسیات زندگی کے معنی و

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مقصد سمجھنے میں ہماری کیا مدد کرسکتی ہے۔ نفسیات ہمیں اپنے آپ کو، اپنے اخلاق، اپنی خصلت، اپنے جذبات، اپنے ماحول کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ یعنی یہ کہ ہم نفسیات کے ذریعہ اپنی شخصیت کا بخوبی مطالعہ کرسکتے ہیں۔ اس طرح ہمیں یہ معلوم ہوجاتا ہے کہ ہم میں کیا کیا خوبیاں موجود ہیں اور ہم میں کس قسم کی کتنی صلاحیت ہے۔ جب ہم کوئی غلطی کرتے ہیں تو نفسیات ہمیں اس غلطی سے آگاہ کردیتی ہے، اور ان خامیوں کے دور کرنے میں مدد و معاون بنتی ہے۔ بہرحال زندگی کا کوئی بھی مقصد ہو اس کے لئے نفسیات کی امداد از حد ناگزیر ہے۔

مذہب. سائنس. فلسفہ اور نفسیات کے علاوہ عوام الناس کی رائے کو بھی زندگی کے مقصد متعین کرنے میں کافی دخل ہے۔ اگرچہ ظاہری طور پر رائے عامہ کی طاقت محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن جمہوریت کے دور دورے میں رائے عامہ بھی ان طاقتوں میں سے ایک طاقت ہے جس کا زندگی پر کافی اثر ہوتا ہے۔

زندگی کی حقیقت وہی بہتر سمجھ سکتا ہے جو فہم و ذکاوت سے کام لیتا ہے اگرچہ حقیقت و مقصد جزوی ہی کیوں نہ ہوں۔ قسمت کو اپنا مخالف سمجھ بیٹھنا ہمیں صحیح فیصلہ کرنے سے باز رکھتا ہے، دنیا کو بری جگہ یا اپنا دشمن تصور کرنے سے ہم زندگی کا صحیح تجزیہ نہیں کرسکتے اور نہ اس کے صحیح مقصد کو حاصل کرسکتے ہیں۔

عام طور پر انسان روح کو جسم سے افضل تصور کرتا ہے لیکن وہ یہ بھی بخوبی سمجھتا ہے کہ روح کا اظہار جسم ہی سے ہوتا ہے۔ گویا زندگی میں نفس کو جسم پر اقتدار حاصل ہوتا ہے۔ زندگی کی ظاہری یا خارجی مشکل حل کرنے سے پہلے نفس اور روح کا عقدہ حل کرنا لازم ہے۔ مادی اور روحانی قوتوں میں کامل اتحاد و اشتراک پیدا کرنا زندگی کا سب سے بڑا مقصد ہونا چاہئے۔ اول تو اس وجہ سے کہ تناسب و اعتدال ہی اپنی جگہ باعث مسرت و راحت ہے اس کے علاوہ کامیابی اور استکمال نفس و روح کا یہی ایک راستہ ہے۔ استکمالِ نفس سے مراد وہ روحانی سکون ہے جسے مادی ملکیت یا مفاد کے مقابلہ میں ترجیح دی جائے لیکن مادی مفاد اور روحانی سکون میں امتیاز آسانی سے نہیں ہوسکتا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مندرجہ بالا نتائج کی روشنی میں مجموعی طور پر ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کام یا عمل زندگی کا بہترین مقصد ہے لیکن کام اسی صورت میں اچھا مقصد ثابت ہوتا ہے جبکہ ہم اپنے فرائض کو فخر و مسرت سے انجام دیں۔ ایسے کام کرنے والے کو ایک روحانی سکون حاصل ہوتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ میری زندگی کارآمد طور پر بسر ہو رہی ہے اس کی بجائے وہ شخص جو محض لالچ یا فائدے کی خاطر کام کرتا ہے اس کا کام کسی تعریف کا مستحق نہیں ہو سکتا بلکہ ایسا شخص اخلاقی حیثیت سے قابل رحم ہے۔

کام کے علاوہ طاقت حاصل کرنے کی خواہش بھی زندگی کا ایک مقصد بن سکتی ہے یہ خواہش عام ہے اور تقریباً ہر انسان میں کم و بیش پائی جاتی ہے یہانتک کہ کسی شخص میں اس خواہش کا فقدان قابلِ حیرت ہے۔ دنیا کے ہر گوشہ میں اور زندگی کے ہر شعبہ میں یہی خواہش مختلف صورتوں میں کارفرما نظر آئے گی۔ خواہ وہ سیاسی طاقت کی خواہش ہو یا دولت کی۔ خواہ وہ معاشرتی طاقت ہو یا فوجی طاقت۔ بہرحال یہ خواہش طاقت کے مختلف ذرائع کے حاصل کرنے سے متعلق ہوتی ہے۔ اس طاقت کے صحیح یا غلط استعمال ہی میں انسانی کیریکٹر کا سب سے بڑا امتحان مضمر ہے۔

مثلاً کسی شخص کو کسی پیشے میں خاص مہارت حاصل ہونے سے جو طاقت میسر آتی ہے وہ بھی ہوس کی تسکین کا باعث ہوتی ہے۔ دنیا اس طاقت کو بنظر استحسان دیکھتی ہے اور یہ طاقت اس طاقت سے بہتر ہے جو زبردستی حاصل کی جائے۔

آج کل زندگی بسر کرنے کے لئے مختلف مقاصد کا انتخاب کیا جا سکتا ہے مثلاً آرٹ، طلب علم، لیڈری، خدمت خلق، سیر و سیاحت، فلسفہ و سائنس، تصنیف و تالیف، ملازمت غرض یہ اور اس کے ماسوا تمام اور کام ہر شخص کی طبیعت و افتاد کے مطابق الگ الگ مناسبت رکھتے ہیں۔ اس میں سے ہر کام کے لئے اس کے کرنے والے میں جو ضروری خصوصیات یا خوبیاں ہونی چاہئیں ہونی لازمی ہیں۔ غرض جو کام بھی کیا جائے اس میں بہتر سے بہتر طریقہ پر فرائض کی انجام دہی کو ملحوظ رکھا جائے اس میں کسی لالچ یا حرص کو دخل نہ ہو۔ ایسی صورت میں کام کرنیوالے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے قلب کو یقیناً سکون حاصل رہے گا اور وہ خوش رہیگا۔ اسی طرح ہر شخص اپنے نفس کا جائزہ لے سکتا ہے اور جان سکتا ہے کہ اس کا مقصد زندگی صحیح ہے یا نہیں۔ اگر نہیں ہے تو اسے اپنی قوتیں صحیح راہ پر لگانی چاہئیں پھر وہ جتنا اپنا مقصد زندگی حاصل کرنے میں کامیاب ہوگا اتنا ہی اسے راحت و سکون حاصل ہوتا رہے گا۔ جو مقصد اپنی قابلیت و صلاحیت اور ماحول کا اندازہ لگا کر متعین کیا جائے اور بتدریج اس کے حاصل کرنے کی کوشش کی جائے وہی بہترین مقصدِ زندگی ثابت ہو سکتا ہے، اور اسی سے اطمینانِ قلب بھی نصیب ہو سکتا ہے اس لئے سب سے پہلے ہمیں اپنے خود کو سمجھنے کی ضرورت ہے لیکن اس کے ساتھ ہی دوسروں کو بھی سمجھنا ضروری ہے۔

کیونکہ دوسروں کو سمجھے بغیر ہم ان کے ساتھ اپنی زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ دوسروں کو سمجھنے کے لئے بھی پہلے اپنے کو سمجھنا ضروری ہے۔ کسی حادثے کے وقت اگر ہم اپنی رنج کی کیفیت سے واقف ہوں گے تب ہی ہم دوسروں کے رنج کا احساس کر سکتے ہیں۔ اسی طرح ہر موقعہ پر جب ہم اپنے سے سوال کریں کہ میں ایسے موقعہ پر کیا محسوس کرتا، یا کیا عمل کرتا۔ تب ہی ہم دوسروں سے اس عمل یا احساس کی توقع کر سکتے ہیں۔ اسی لئے مذہب بھی ہمیں یہی بتاتا ہے کہ ہم دوسرے انسانوں ہی کو نہیں بلکہ خدا کو بھی جب ہی سمجھ سکتے ہیں جب ہم اپنے آپ کو سمجھیں۔ من عرف نفسہ فقد عرف ربہ ۔

آج کل اپنے کو جاننے کے لئے بھی ایک سائنٹفک علم اور عمل ہے لہذا ہمیں اپنے نفس کا تجزیہ قاعدے اور اصول کے ماتحت کرنا چاہئے۔ یہ قاعدے اور اصول یکساں طور پر ہر شخص کے لئے مقرر نہیں کئے جا سکتے بلکہ آپ اپنے نفس کے سامنے دیانتداری کے ساتھ اپنے متعلق سوچئے۔ ذاتی خوبیوں اور عیوب کا علم کسی اور کو ہو یا نہ ہو آپ کو خود ان کا علم ہونا ضروری ہے۔

مثلاً آپ پہلے اپنی جسمانی خصوصیات کا جائزہ لیں پھر اپنی ذہنی قابلیتوں کی جانچ کریں، اپنے جذبات کی کیفیتوں کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اپنے بچپن کے واقعات اور اپنی سوسائٹی اور اس کے رجحانات کو مدنظر رکھیں۔ اخلاقیات کے متعلق اپنے عقائد کا جائزہ لیں اور جماعتی میل جول میں اپنی کامیابی و ناکامیوں پر غور کریں پھر یہ دیکھیں کہ آپ کیا کیا ہنر جانتے ہیں جو ہنر جانتے ہیں وہ سطحی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طور پر جانتے ہیں یا واقعی ان کا آپ کو معتبر علم ہے اور اگر ابھی کمال حاصل نہیں ہوا تو اس کے حاصل کرنے میں آپ کتنی کوشش صرف کرتے ہیں۔ آپ کی زندگی کا کیا مقصد ہے۔ زندگی آپ کے نزدیک کس نہج پر بسر ہونی چاہیئے۔

لیکن بعض اوقات انسان اپنے متعلق سونچتا ہے اور کافی سونچنے کے بعد بھی وہ کسی نتیجہ پر نہیں پہنچتا اور نہ اسے قلبی اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ جب یہ صورت ہو تو آپ سمجھ لیجئے کہ آپ نے اپنے کو ابھی نہیں سمجھا۔ اپنے آپ کو سمجھنا آسان نہیں ہے بعض اوقات اپنے متعلق متواتر غور کرنے اور اپنے حقیقی دوستوں کی اپنے متعلق رائے سننے کے بعد ہم اپنے آپ کو سمجھ پاتے ہیں۔ اس وقت آپ کو محسوس ہوگا کہ گویا آپ نے اپنے کو پہلے کبھی اس روشنی میں نہیں دیکھا تھا لیکن ساتھ ہی ساتھ آپ کو یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ اپنے متعلق بہت زیادہ سونچنا یا غور کرنا بھی مضر ہے۔ حد سے تجاوز کرنا ہر صورت میں نقصان دہ ہوتا ہے کیونکہ اس طرح ہمارے بہت سے فطری جذبات پر بے جا دباؤ پڑیگا جس کی وجہ سے صحیح راستہ سے بھٹک جانے کا اندیشہ ہے۔ جذباتِ آقا ہیں اور دماغ و ذہن ان کا مطیع ہے۔ اس کے علاوہ اپنے متعلق صحیح کام انتخاب کرنے میں یا مقصدِ زندگی کی تلاش میں آپ کا ضمیر بھی آپ کی مدد کرسکتا ہے۔ ایک تپ دق کے بیمار کی زندگی اگر اس کی مرضی کے مطابق بسر ہونے لگے اور اس کے جذبات کا اظہار بغیر کسی روک ٹوک کے ہوسکے تو یقیناً اس کی تپ دق دور ہوجائے گی اور وہ صحیح اور طبعی زندگی بسر کرنے لگیگا۔ ہمارا کام زندہ رہنا اور کام کرنا ہے۔ ہر شخص خود اپنے متعلق دوسروں سے بہتر اور صحیح علم رکھتا ہے۔ آغاز و انجام ایسی چیزیں ہیں جن کا علم ہمیں نہیں ہے نہ دنیا کے آغاز و انجام کے متعلق ہمیں علم ہے اور نہ اپنے ہی متعلق کچھ اطلاع ہے۔ ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ ہم اپنے آغاز و انجام سے بے خبر ہیں اور اس زندگی کی مہم کو سر کرنے میں مصروفِ کار ہیں۔ حصولِ مقصد کی بہ نسبت حصولِ مقصد کی سعی اور اس کا زمانہ زیادہ دلچسپ اور مسرت آمیز ہوتا ہے اگر مقصد ہی مقصد ہماری گردن پر سوار رہے تو اس کا نتیجہ سوائے مصیبت اور گھبراہٹ کے اور کچھ نہیں ہوگا۔ تاریخ بھی اس امر کی شہادت دیتی ہے کہ کسی مہم کا سر کرنا انفرادی اور اجتماعی ہر دو اعتبار سے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

روح افزا ہے۔ ناممکن کو ممکن بنانے میں زندگی کی مسرتیں پوشیدہ ہیں۔

لیکن ان لوگوں کا کیا ہو سکتا ہے جن کے لئے زندگی میں کوئی دلکشی ہی نہیں اور جو ہر صبح کو روز بد کا آغاز تصور کرتے ہیں۔

ہم ان سے کہہ سکتے ہیں کہ اگر زندگی کا کوئی مقصد متعین نہیں ہے تب بھی آپ اس کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور قرار دیں بشرطیکہ آپ کو اس کا طریقہ معلوم ہو، سب سے پہلا قدم اس سلسلے میں یہ ہونا چاہیئے کہ آپ اپنی زندگی کا کوئی صاف وصریح مقصد مقرر کریں اور پھر غور کریں کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے آپ کیا عمل کر سکتے ہیں۔ آیا وہ عمل اس کے وصول کے لئے کافی ہے یا نہیں۔ پھر یہ دیکھئے کہ آپ کے اس عمل سے وہ مقصد جو آپ کے تخیل میں موجود ہے کس حد تک پورا ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ آپ کیا واقعی اپنی زندگی اس ارادے کی تکمیل کے لئے بسر کر رہے ہیں یا نہیں اگر آپ کی زندگی کا روزانہ عمل آپ کے اطمینانِ قلب کے لئے کافی نہ ہو تو آپ کو نئے راستے سوچنے پڑیں گے اور اس کے مطابق اپنے عمل کو بھی بدلنا پڑے گا اور اس میں کچھ تفریح طبع کے سامان بھی بہم پہنچائے جا سکتے ہیں اور روزانہ کام کے علاوہ کوئی تفریحی مشغلہ بھی پیدا کیا جا سکتا ہے۔

زندگی کا مقصد متعین کرنے کے لئے ایک اور قدم بھی اٹھایا جا سکتا ہے جو اب تک یورپ وایشیا بلکہ تمام دنیا میں یکساں طور پر کامیاب ثابت ہوا ہے اور وہ خدمتِ خلق ہے۔ دیکھا جائے تو یہ اصول زندگی کے ہر شعبہ میں کارفرما ہے۔ یہاں تک کہ سوداگری جیسے خالص دولت اکٹھا کرنے کے پیشے میں بھی وہی سوداگر زیادہ کامیاب ہوتا ہے جو اپنے گاہکوں کی سب سے اچھی اور بہتر خدمت کرتا ہے۔ اسی اصول کے مدنظر مختلف کمپنیاں اپنے سروس اسٹیشن (Service Station) قائم کرتی ہیں اور اس طرح اپنے گاہکوں کے حلقے کو قائم رکھنے کی کوشش کرتی ہیں اگر ہم ہر صبح ایک شخص کو خوش کرنے کا تہیہ کر لیں تو سال میں تین سو پینسٹھ (۳۶۵) انسانوں کو خوش کر سکیں گے جرمنی کا فلسفی شاعر (Goethe) کہتا ہے کہ زندہ رہنے کا کمال یا آرٹ یہ ہے کہ ہم زندہ رہنے کے لئے اپنا وجود یا اپنی ذات تج دیں۔ یہ اصول اس لحاظ سے اور بھی قابلِ قدر ہے کہ انسان دوسروں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے لئے ذاتیات ترک کرکے ان کی خدمت کے لئے مستعد ہو جائے۔ در اصل اسی اصول کی بنا پر انسان اشرف المخلوقات کہلانے کا مستحق بنا ہے۔ یہی اصول تمام علوم۔ سائنس، تمدن و تاریخ اور مذہب کے کارناموں میں کارفرما نظر آتا ہے۔ انسانی زندگی کا اس سے زیادہ افضل اور اشرف اور کوئی مقصد نہیں ہو سکتا۔ اسی مقصد میں وہ طاقت اور وہ اثر پوشیدہ ہے جو مستقل طور پر انسانوں کے لئے مشعل ہدایت بنا رہا ہے اور آئندہ بھی بنا رہے گا۔ اسی اصول پر ہمارے پیغمبر و رہبر خود عمل کرکے بنی نوعِ انسان کے لئے ایک صحیح راستہ چھوڑ گئے ہیں جس پر چل کر انسان خود اپنے لئے اور بنی نوعِ انسان کے لئے مسرت اور فلاح و بہبود حاصل کر سکتا ہے۔

فیض الباری

مطبوعہ مصر

فیض الباری نہ صرف ہندوستان بلکہ دنیائے اسلام کی مشہور ترین اور مایۂ ناز کتاب ہے۔

شیخ الاسلام حضرت علامہ سید محمد انور شاہ صاحب قدس سرہ جو اس صدی کے سب سے بڑے محدث سمجھے گئے ہیں فیض الباری آپ کی سب سے زیادہ مستند عظیم الشان علمی یادگار ہے جسے چار ضخیم جلدوں میں دل آویزی و دل کشی کی تمام خصوصیتوں کے ساتھ مصر میں بڑے اہتمام سے طبع کرایا گیا ہے۔

فیض الباری کی حیثیت علامہ مرحوم کے درس بخاری شریف کے امالی کی ہے جس کو آپ کے تلمیذ خاص مولانا محمد بدر عالم صاحب رفیق ندوۃ المصنفین دہلی نے بڑی قابلیت، دیدہ ریزی اور جانکاہی سے مرتب فرمایا ہے۔ حضرت شاہ صاحبؒ کی تقریروں کے علاوہ فاضل مولف نے جگہ جگہ تشریحی نوٹوں کا اضافہ کیا ہے جس سے کتاب کی افادی حیثیت کہیں سے کہیں پہنچ گئی ہے

مکمل چار جلدوں کی قیمت ۱۶ سولہ روپے

منیجر مکتبہ برہان دہلی قرول باغ

© rasailojaraid.com